استحکام پاکستان کیلئے سیاست اور امور خارجہ کے رہنما اصول سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر مخدوم روشن صدیقی
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج قاسم آباد، حیدرآباد

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات نے انسانوں کے لئے جو فکر اور فلسفہ متعین کیا وہ ہمارے اس قرآن کریم کی صورت میں موجود ہے۔ قرآن کریم صرف اپنے ماننے والے (مسلمانوں) کی فکر اور زندگی گزارنے کا آئین اور دستور نہیں بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے زندگی گزارنے کا دستور ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پوری دنیا کے انسانوں کا رب ہے، لہٰذا زندگی گزارنے کا دستور بھی پوری دنیا کے انسانوں کی ہدایت کے لئے ہے۔ پھر جو بھی انسان اس قرآنی نظریے کو نہیں اپنائے گا وہ ناکامی اور خسارے کی زندگی گزارے گا۔

جیسے آج دنیا کے اندر انسانیت کی حالت ہے کہ قرآن کریم کے نظریہ کو چھوڑنے کے بعد انہوں نے دنیاوی ترقی تو حاصل کرلی، لیکن معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں وہ جانوروں کی طرح ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے مادی افکارات اور نظریات انسان کو دنیاوی ساز وسامان تو مہیا کرسکا، لیکن بہترین، بااخلاق اور باکردار انسان نہ دے سکا۔ جس کو اللہ نے اشرف المخلوقات کا منصب عطا کیا تھا۔ مادہ پرست انسانوں نے یا تو اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں توریت، انجیل، زبور اور دیگر صحیفوں میں جو کہ قرآن کے آنے کے بعد منسوخ ہوگئیں ہیں میں تبدیلی کر کے ان کو اپنی فکر بنایا، اور کچھ لوگوں نے کچھ مذہبی تصورات اور انسانی تجزیات کی بنیاد پر اپنا نظریہ اور نظام بنایا کچھ لوگوں نے صرف انسانی تجزیات کی بنیاد پر معاشرتی اور اجتماعی اصول بنائے اور ان کے تعین میں مذہبی عقائد اور معیار کو نظر انداز کردیا، جبکہ اس کے برعکس مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر ہدایت اپنے اسلام سے حاصل کرتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس اسلام صرف مذہب نہیں ہے جو صرف ذاتی زندگی کے معاملات کی حد تک محدود ہو، بلکہ اسلام ایک کامل دین اور

مکمل نظام حیات ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق کو قائم کرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے بیچ میں تعلقات اور حقوق کو بھی متعین کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو کنٹرول کرتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ مسلمان انسان کے تاریخی تجربوں سے کچھ بھی حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ ماضی کے واقعات، تجزیات اور علوم سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور ان سے حاصل ہونے والی صحیح اور مفید چیزوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپناتا ہے۔ لیکن مسلمان صرف انسانی فکر اور تجربات کو اخذ اور اختیار کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ اس کے نزدیک اخذ اور اختیار کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دستور قرآن حکیم اور قرآن حکیم کے شارح اور معلم آخر رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل (سنت نبوی) ہے۔ یعنی جو حکم قرآن کریم اور سنت کے مطابق ہوگا، مسلمان اس کو اختیار کرے گا۔ جو اس کے مطابق نہیں ہوگا، اس کو وہ مسترد کر دیتا ہے، گویا کہ قرآن اور سنت ان کے لئے کسوٹی ہے، جس پر وہ اپنے ہر عمل کو پرکھتے ہیں۔ مسلمان اپنا ہر قانون اور اصول قرآن وسنت کے مطابق بناتے ہیں۔ پھر قرآن کریم کی فکر کے تین بنیادی اصول ہیں۔

۱۔ تعلیم احکام، ۲۔ تہذیب اخلاق، ۳۔ تنظیم اعمال

تعلیم احکام سے مراد شریعت، تہذیب اخلاق سے مراد طریقت، اور تنظیم اعمال سے مراد سیاست ہے۔ یعنی دین اسلام شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعے کا نام ہے۔ اسلام ان تینوں اصولوں پر عمل کئے بغیر کامیابی کا کوئی راستہ نہیں اور نہ ہی یہ تینوں اصول ایک دوسرے کے بغیر مکمل ہو سکتے ہیں۔ شریعت سے مراد راستہ ہے، اگر راستہ ہی سامنے نہ ہوگا تو سفر کیسے کیا جائے گا، طریقت سے مراد راستے پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا کرنا ہے کیونکہ راستے پر چلنے کی اگر قوت نہ ہوگی تو پھر راستہ کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو وہ کس کام کا، پھر سیاست سے راستے کی رکاوٹوں کو صاف کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر راستہ پتھریلا اور پرخار ہو تو وہاں طاقت اور قوت بھی ہو تو وہ کیا کام کرے گی۔ اگر یہاں طاقت سے کام بھی لیا جائے تو ساری طاقت تو راستے کی صفائی میں خرچ ہو جائے گی، پھر حقیقی منزل پر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا شریعت راستہ ہے، طریقت

راستے پر چلنے کی قوت اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔

قوت ہمیشہ مخفی ہوا کرتی ہے، راستہ ہمیشہ ظاہر ہوتا ہے، جبکہ راستے کی صفائی کا کام نہ صرف ظاہر بلکہ کافی زور وشور سے ہوتا ہے۔ اگر صرف طریقت ہو جس میں شریعت اور سیاست نہ ہو تو وہ صرف وشت اور خجالت ہے، اگر صرف شریعت ہو جس کے ساتھ طریقت اور سیاست نہ ہو تو پھر وہ صرف شدت اور جمود ہے اور اگر صرف سیاست ہو جس کے ساتھ طریقت اور شریعت نہ ہو تو وہ صرف تکبر اور غرور ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ تینوں اصول اپنی جگہ پر اکیلے کامل نہیں، بلکہ ہر ایک ان میں سے دوسرے کے لئے سہارا اور اصلاح کرنے والا ہے۔ اسی لئے ان سب کو جمع کر کے ''دین'' کہا جائے گا۔ تو پھر طریقت کی وحشت شریعت اور سیاست سے درست ہوگی جن کی بنیاد میل میلاپ اور اجتماعیت پر ہے، شریعت کا جمود طریقت سے درست ہوگا جس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے اور تشدد و جمود ختم ہو جاتا ہے، سیاست کے تکبر اور آمریت کی اصلاح شریعت اور طریقت میں ہے۔ جس کی ملاوٹ سے شفقت علی الخلق یعنی مخلوق پر پیار اور نرمی پیدا ہوتی ہے۔

پھر جب ایک طرف طریقت اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے نفس میں عدالت پیدا ہو جائے اور شریعت کے ذریعے احکامات الٰہی کا علم، نیکی کی تعلیم اور شفقت کا جذبہ قائم ہو جائے تو سیاست وقوت کے ذریعے علم اخلاق اور حسن اخلاق کے نافذ کرنے کی قدرت پیدا ہو جائے تو سیاست سے تکبر اور ہٹ دھرمی نکل کر اس کی جگہ وقار، خودداری اور بہادری آ جاتی ہے۔ طریقت سے صرف خلوت کی رسم نکل کر اس کی جگہ اللہ تعالیٰ سے خلوت کے ذریعے تعلق قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تمام احکامات کی پابندی کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، جبکہ شریعت سے خشکی، جمود، تنگ نظری ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی جگہ وسعت نظری، جامعیت، ہمہ گیری آپس میں ایک دوسرے سے تعاون اور اتحاد کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ جس سے قوم کی مادی اور روحانی ترقی کا نقشہ خود بخود قائم ہو جاتا ہے جس کے مجموعے کو دین کہا جاتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین ان تینوں اصولوں کو جمع کرنے کے سوا مکمل نہیں ہو سکتا،

جبکہ خدام دین تب تک دین کی صحیح معنی میں خدمت نہیں کرسکیں گے، جب تک وہ ایک ہی وقت میں شریعت، طریقت اور سیاست کو اپناتے ہوئے متشرع، صوفی اور سیاسی ہوں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج ان تینوں اصولوں کو جدا جدا مستقل شمار کیا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا جدا جدا دعویدار اسے جدا جدا طبقہ شمار کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں طریقت کے علمبردار صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں۔ پھر بجائے اس کے کہ یہ تینوں طبقے مل کر ایسی قوت کے مقابلے میں آئیں جنہوں نے ان کے علم کو بھی غلط قرار دے دیا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط انداز میں معاشرے میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی اپنی قوت کو آپس میں ایک دوسرے کو پست کرنے میں ضائع کر رہے ہیں، جس سے فرقہ واریت کی طاقت اور زیادہ طاقتور اور مضبوط ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا یہ تینوں طبقے جب تک اکھٹے نہیں ہوں گے اور صرف اکھٹے نہ ہوں بلکہ ہر ایک جب تک خالص شریعت کا پابند، صوفی اور مخلص سیاسی نہیں ہوگا تب تک قوم بحیثیت مجموعی، مکمل اور کامل قوم نہیں کہلائے گی اور نہ ہی اسلامی نظریے پر کامیابی کا منہ دیکھ سکے گی۔

اسلام میں دین سیاست سے جدا نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے دو حصے علم احکام اور حسن اخلاق دیانت کے بنیادی شعبے ہیں، جبکہ ایک حصہ نظم اور اجتماعیت میں پورا سیاست کا شعبہ ہے۔ اگر سیاست کو دیانت سے جدا کیا جائے گا تو نہ حقیقی سیاست قائم ہوگی اور نہ ہی حقیقی دیانت، کیونکہ اگر سیاست کے ساتھ دیانت نہ رہی تو سیاست سراسر ظلم اور آمریت کا محور ہوگی اور اگر دیانت کے ساتھ سیاست نہ رہی تو پھر دیانت مجبور، بے یارومددگار اور پست ہو جائے گی۔ اسی بات کو شاعر مشرق علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لہٰذا صرف قانون اور جھوٹی سیاست سے دنیا کبھی بھی امن وسکون کا منہ نہیں دیکھے گی اور نہ ہی انسانی دنیا کی اصلاح ہوسکے گی۔ اگر صرف قانون اور سیاست سب کچھ ہوتے تو آج

یورپ سب سے زیادہ صالح، نیک اور سب سے زیادہ قانون پر چلنے والا، سب سے زیادہ امن والا ہوتا۔

اگر صرف سیاست اور قانون سازی سے انسانی ذات کی اصلاح ہوتی تو آج یورپی دنیا کو ایسے دن دیکھنے نہ پڑتے کیونکہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے اور نہ قانون کی، اگر کمی ہے تو صرف دیانت کی کمی ہے۔ یعنی وہاں سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی موجود ہیں نہ ہی مقاصد الٰہیہ کا علم اور نہ ہی اس کا عملی نمونہ موجود ہے۔ اس لئے جب سیاست کا دائرہ ہی صحیح سمت میں نہ ہوگا تو پھر صرف کھوکھلی سیاست اور خالی قانون کی اونچ نیچ سے لوگوں کو امن اور دنیا کو سکون کیسے نصیب ہوگا؟

پس آج کی یورپی تباہ کاریاں، عالمی بربادیاں اور انسانیت کی تباہی سیاست کے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دیانت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے بظاہر میڈیا کے ذریعے سے یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں ملک اتنا ترقی یافتہ اور امن یافتہ ہے، لیکن اگر ہم ذرا تفتیش کرتے ہیں تو حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے، جیسے اس وقت پوری دنیا میں سپر پاور بننے کا خواب دیکھنے والے امریکہ کا حال یہ ہے کہ ایک شہر لاس اینجلس Loos Angles میں بجلی چلی جانے کی وجہ سے وہاں بے شمار قتل، ڈاکے اور اجتماعی زنا ہوتے ہیں۔

انگلینڈ کے قانون کا یہ حال ہے کہ وہاں مرد کا مرد سے ملاپ کا قانون تالیوں کی گونج میں پاس کیا جاتا ہے، لہٰذا جب انسان ایک بے شعور درندہ بن جائے تو صرف سیاست اس کے دل و دماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی، یہ ذہنی انقلاب صرف تہذیب اخلاق اور کتاب اللہ کی تعلیم سے ہی ممکن ہے، جو کہ دیانت کا ذخیرہ ہے۔ اس لئے دیانت سیاست کے بغیر اور علم و اخلاق شان و شوکت کے بغیر بے بس، لاچار اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہونے کی وجہ سے عوام میں مقبولیت اختیار نہیں کر سکیں گے۔

خسر الاخرة: جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم و اخلاق کی دیانت نہ ہوگی تب تک دنیا کبھی بھی امن و سکون کا سانس نہیں لے سکے گی۔ جیسے حدیث پاک میں

ہے کہ فرمایا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

الملک و الدین توامان(۱)

حکومت اور دین آپس میں دو جڑواں بھائی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت (دنیا سے الگ ہو کر زندگی گزارنا) کو ختم کر کے اس کے ساتھ سلطنت کو ملا دیا اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اسے خلافت کا کرتہ پہنایا تا کہ جس سے دیانت اور سیاست کا حکمت والا ملاپ قائم ہو اور اسی جامعیت سے اخلاقی اقدار بلند ہوں گے اور دین کی شان و شوکت نشو و نما پائے گی۔

اسی واسطے ایمان کے دو رکن فرمائے گے۔

۱. التعظیم الأمر اللّٰہ، ۲. والشفقته علی خلق اللّٰہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے امر کی تعظیم کرنا کہ اس کے سامنے جھک جانا دوسرے اس کی مخلوق پر شفقت اور اس کی خدمت کرنا، دونوں باتوں سے مل کر ایمان بنتا ہے۔ یعنی ایک شخص چوبیس گھنٹے مسجد میں رہے مخلوق چاہے جیئے یا مرے، اسے کوئی پروا نہیں۔ اس کا آدھا ایمان ہے، اور ایک شخص رات دن مخلوق کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ مگر مسجد میں جانے کا نام نہیں لیتا، اس کا آدھے سے بھی کم ایمان ہے۔ اس لئے کہ خلافت کا کام تو انجام دیا، مگر عبادت چھوڑ دی، انسان مکمل تب ہوگا جب ایک طرف عابد و زاہد ہو، اور ایک طرف خلیفۂ خداوندی ہو، ایک طرف وہ کام کرے جو مخلوق کے کرنے کا ہے وہ عبادت ہے، ایک طرف وہ کام کرے جو خالق کا ہے۔ وہ تربیت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی زندگی ہے کہ راتوں کو دیکھو تو تہجد پڑھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ورم آجاتا تھا۔ دنوں میں دیکھو تو مخلوق کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط جاری فرما رہے ہیں، جن میں اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے۔ سفر فرما رہے ہیں، کبھی طائف میں ہیں، کبھی مدینہ میں تا کہ خلق خدا نیک راستے پر آجائے یہ خلافت کا کام ہے۔ مسجد نبوی میں جس طرح سے آپ نماز پڑھتے۔ اسی طرح سے آپ مقدمات کے فیصلے بھی

فرماتے، مسجد میں جیسے عبادت ہوتی ویسے ہی درس وتدریس کے ذریعے تعلیم بھی ہوتی، یہ خلافت کا کام تھا۔ نماز پڑھنا، تلاوت کرنا، سجدے کرنا، یہ عبادت کا کام تھا۔

یہی شان صحابہ کرامؓ کی ہے کہ ایک طرف تخت خلافت پر بیٹھ کر مخلوق خدا کی اصلاح، اور ایک طرف بوریا اور چٹائی پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز و نیاز سے سر جھکا دینا۔ جب ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو صحابہ کی زندگی کے ایسے لاتعداد واقعات ملیں گے جیسے:

فارس میں جب جنگ ہوئی ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی تعداد کل تیس یا تینتیس ہزار تھی، فارسیوں کا تین لاکھ کا لشکر تھا پھر فارس کی فوجیں کیل کانٹے سے مسلح وردیاں غزائیں اور دیگر ساز وسامان کے ساتھ تھیں جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین محض درویشوں کا ایک لشکر، وردی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس کرتہ نہیں ہے تو کوئی لنگی باندھے ہوئے ہے کسی کے پاس لمبا کرتہ کسی کے سر پر پگڑی نہیں تو رسی باندھ رکھی ہے کسی کے ہاتھ میں نیزا، کسی کے ہاتھ میں تلوار، کسی کے ہاتھ میں خنجر، ہتھیار، لباس نہ غزائیں کچھ بھی باقاعدہ نہیں، درویشوں کا لشکر ہے، مگر کیفیت یہ تھی، لاکھوں فارسی آتے تھے، جب صحابہ رضوان اللہ اجمعین بھوکے شیروں کی طرح حملہ کرتے تھے تو وہ بلیوں کی طرح بھاگتے تھے اور یہ غالب تھے، پورے فارس میں ایک تہلکہ مچ گیا، فارس کا سب سے بڑا سپہ سالار رستم تھا۔ آپ نے رستم پہلوان کا نام سنا ہوگا وہ کمانڈر ان چیف تھا، اس نے تمام سرداروں اور کمانڈروں کو جمع کیا اور کہا کہ یہ غضب کی بات ہے کہ ہمارا لشکر تین لاکھ اور عرب کے بدو کل تیس ہزار، پھر ان کے پاس سامان باقاعدہ نہیں، ہمارے پاس سامان ہے، انہیں مدد نہیں پہنچ رہی، جبکہ ہمارے پیچھے پورا ملک ہے۔ یہ ہمارے ملک میں حملہ کرنے آئے ہیں، ان کا ملک دور رہ گیا یہ ہمارے ملک میں گھرے ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود وہ حملہ کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھوکے شیر ہیں اور تم فارسی اس طرح سے بھاگتے ہو جیسے لومڑیاں بھاگتی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ سرداروں نے کہا: اے رستم اگر آپ سچی بات پوچھیں ہم بتلا دیں مگر ہماری جان کی بخشش کر دی جائے امان دیا جائے کہ ہمیں قتل تو نہیں کیا

جائے گا۔ اس نے کہا تمہاری جان کو امان دی جاتی ہے۔ اب سرداروں نے مل کر کہا: اے رستم یہ مٹھی بھر عرب تیرے ملک پر غالب آ کر رہیں گے انہی کا قبضہ ہوگا انہی کی حکومت ہوگی۔ پورا ایران ان کی تسلط میں آئے گا۔ یہ نہیں ہاریں گے تم ہارو گے۔ رستم نے کہا کیوں؟ انہوں نے کہا: اس وجہ سے کہ ان کی شان یہ ہے:

هم بالیل رهبان و بالنهار فرسان.(۲)

دن بھر یہ گھوڑے کی پشت پر سوار جہاد میں مصروف ہیں اور رات میں مصلے کی پشت پر سوار ہیں اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے مالک: ہم میں کوئی طاقت نہیں، طاقت والا تو ہے ہم تیرے سپاہی ہیں۔ تو اگر ہمیں فتح دے گا تو ہم فتحیاب ہو جائیں گے۔ تو اگر ہمیں شکست دے گا تو ہم شکست کھا جائیں گے ہمارے اندر کوئی طاقت اور قوت نہیں قوت و سلطنت تیری ہی ہے۔ یہ رات بھر اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ عجز و نیاز سے پیشانی سرزمین پر رگڑتے ہیں اور دن کو گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جس گاؤں میں جاتے ہیں اگر کھیتیاں جلی ہوئی ہوتی ہیں تو سرسبز ہو جاتی ہیں، یہ دوسروں کی بیٹیوں کی ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں، جیسے اپنی بہو بیٹیوں کی کرتے ہیں، اور اے رستم: تیرے لشکر کا تو یہ حال ہے کہ شرابیں پیتے ہیں، جس گاؤں میں جا پڑتے ہیں، کھیتیاں سب برباد ہو جاتی ہیں، یہ اثرات تیری فوج کے ہیں، اور یہ افعال ان کی فوج کے ہیں، تو غلبہ تجھے ہوگا یا ان کو ہوگا؟ لہٰذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین راتوں کو مصلے کی پشت پر عبادت میں مصروف اور دنوں کو گھوڑے کی پشت پر سوار اللہ کے نائب بن کر دنیا کی اصلاح کے درپے تھے، تو درحقیقت رستم اور اس کے سرداروں نے پہنچانا کہ ان بزرگوں میں یہی دو چیزیں تھیں۔ ایک طرف یہ عبادت میں کامل اور ایک طرف خلافت میں کامل، ایک طرف سر نیاز اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہے ایک طرف اس کی مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں سفر کر رہے ہیں جو مفسد سامنے آتا ہے، اسے راستے سے ہٹا دیتے ہیں، تاکہ دین پہنچ سکے اور لوگ دین کے اوپر عمل کر سکیں۔

بہرحال جب مقصد زندگی عبادت اور خلافت نکلا سب سے بڑے عابد دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور سب سے بڑے اللہ کے نائب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو ان کی امت کو بھی سب سے بڑا عابد اور سب سے بڑا نائب خداوندی بننا چاہئے۔ یہ امت اس لئے آئی ہے کہ رات دن عبادت میں مصروف رہے، رات دن اللہ تعالیٰ کی نائب بن کی مخلوق کی اصلاح کرے، یہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اٹھے، اپنی زندگی اور موت کا مقصد یہ سمجھتے کہ میں چاہے جیوں یا مروں، مگر نام خدا کا اونچا ہو تو اللہ اس قوم کو کبھی ذلیل نہیں کرے گا۔ ذلت و رسوائی جب ہوتی ہے جب کوئی خدا کے نام کو چھوڑ کر اپنی برتری چاہے، اپنے عیش کو آگے رکھے۔ خدا کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی۔ اس پر دشمن اقوام مسلط کی جاتی ہیں، جو اس کو غلامی میں بھی جکڑ دیتی ہیں، لیکن جو کہے مجھے ملک و دولت مقصود نہیں، مجھے اللہ کا نام اونچا کرنا ہے۔ میری دولت، میری جان اور خاندان اس کے لئے وقف ہے، اس نصب العین کے تحت زندگی ہوگی، وہ بھی باعزت ہوگی، موت ہوگی وہ بھی باعزت ہوگی۔ انسان کو اصل میں عزت کی زندگی کے لئے اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں ذلیل ہونے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ سب سے بڑے خلیفہ خداوندی اور عابد خداوندی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جیسے وہ سردار انبیاء ہیں۔ تو یہ امت بھی امتوں کی سردار بنائی گئی ہے، اس کو خیر امت اور فضل الامم کہا گیا۔ مگر افضلیت کیوں ہے کھانے پینے اور دولت کی وجہ سے نہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا کام یہ ہے کہ یہ دنیا کی قوموں کی اصلاح کرے، دنیا کی قوموں میں جو کھوٹ ہے اس کو رفع کرے اور اگر یہ دنیا کی قوموں کی نقالی کرنے لگے کہ جو کھوٹ ان کے اندر ہے، وہ اپنے اندر لے لے، تو پھر یہ اصلاح کیا کرے گی اس کا حاصل تو یہ نکلا کہ دوسری قومیں اس پر غالب آئیں گی، یہ صرف ایک چیز سے غالب آسکتی ہے، وہ یہ کہ یہ کلمۂ خداوندی کو اونچا کرنے کا نصب العین لے کر چلے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

تم دنیا کی قوموں پر دولت سے غالب نہیں آسکتے، دولت دوسروں کے

پاس زیادہ ہے، تعداد میں تم دنیا پر غالب نہیں آ سکتے، اہل باطل کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے اور رہے گی، تم اگر دنیا کی قوموں پر غالب آؤ گے تو اخلاق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غالب آؤ گے، کردار سے غالب آؤ گے، دین کو لے کر اٹھو گے تو غالب آؤ گے۔ اس لئے سب سے بڑھ کر تمہارے پاس حجت دین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی حجت نہیں۔"

اگر آپ کسی سے بحث کریں اور یوں کہیں کہ میری عقل یوں کہتی ہے، دوسرا کہے گا میری عقل تم سے زیادہ ہے، میری عقل یوں کہتی ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ہم خادم ہیں ہمیں یہ حکم پورا کرنا ہے۔ دنیا کی ہر قوم چپ ہو جائے گی، اس سے آگے اب حجت نہیں ہے، آگے پھر زور اور طاقت ہے، تو جس قوم کے ہاتھ میں خدا کا نام ہو اور خدا کی نائب بن کر آئے وہ حجت میں بھی اور انجام میں بھی غالب ہوتی ہے۔ (۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کے بعد خلافت ربانی کا کام شروع کیا اور اسلام کی دعوت دی تو پورا مکہ، حجاز اور ساری قوم آپ کی دشمن تھی، عزیز اقربا دشمن، صرف تین آدمی مسلمان ہوئے، بوڑھوں میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور لڑکوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ، باقی سارا خاندان، دشمن لیکن آپ ﷺ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ پورے استقلال کے ساتھ اس کلمہ کو لے کر چلے، قوت مکہ والوں کے ہاتھ میں تھی تعداد ان کی زیادہ تھی۔ دوسری طرف تیرہ آدمی جب مسلمان ہوئے تو دار ارقم میں اندر سے زنجیر لگا کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ خطرے کی وجہ سے مسلمان باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ناداری اور مفلسی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم دار ارقم میں بند تھے، رات کو بارہ بجے میں پیشاب کرنے کے لئے باہر نکلا، صفا کی پہاڑی پر بیٹھا پیشاب کیا، دھار جو پڑی تو ایسی کھنکھناہٹ کی آواز آئی جیسے کاغذ کے اوپر دھار گرتی ہے۔ میں نے پیشاب کرنے کے بعد ٹٹولا۔ معلوم ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر پیشاب گر رہا تھا۔ اس چمڑے کے ٹکڑے کو

لائے، اور پانی سے پاک کیا کئی وقتوں کے بھوکے تھے۔ اس چمڑے کو منہ میں ڈالا جس سے تسلی ہوئی کہ کچھ کھا پی رہا ہوں۔ یہ مفلسی اور ناداری کی کیفیت تھی، تو تعداد مسلمانوں کی تیرہ اور مشرکین مکہ کی تعداد کہیں زیادہ، افلاس کا یہ عالم کہ کھانے کو نہ ملے، خزانے سارے ان کے ہاتھ میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود زندگی کا مقصد یہ تھا کہ اس کلمہ کو اونچا کرنا ہے۔ ہم خواہ مٹیں یا رہیں، تیرہ برس کے بعد پورا مکہ اور پورا حجاز اسلام میں داخل ہوا۔ یہی قوم جو اقلیت میں تھی، اکثریت میں آ گئی، وہ قوم جو بے شوکت تھی، ساری شوکتیں اس کے ہاتھ میں آ گئیں اور جو قومیں شیر بنی ہوئی تھیں وہ اس کے سامنے جھک گئیں، اللہ کا نام لے کر کھڑے ہونے میں جب استقلال وثبات دکھلائے، تو دنیا کی قومیں جھک جاتی ہیں، ہمیں دوسری قوموں کی دولت وعزت نہیں چھیننی، ہمیں تو خدا کا نام پہنچانا ہے، چاہے ہم مر جائیں، مگر یہ کلمہ قبول کرو، اگر اس شان سے چلیں گے دنیا کی قومیں ممنون ہوں گی۔

حدیث میں فرمایا گیا جب کوئی قوم میرے قانون کی خلاف ورزی کرتی ہے اور گناہوں میں ملوث ہوتی ہے، میں دنیا کی اقوام کے دلوں میں ان کے لئے دشمنی اور عداوت ڈال دیتا ہوں، یہ درحقیقت میری طرف سے وہ قومیں جلاد بن کے کھڑی ہوتی ہیں تاکہ معصیت چھڑا دیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اگر یہ چیز تمہیں ناگوار ہو کہ دنیا کی قومیں تم پر غالب آ جائیں اور تمہیں سزائیں دیں ان بادشاہوں کو برا مت کہو، میرے سے معاملہ درست کرلو۔ میں عداوت کے بجائے ان کے دلوں میں محبت ڈال دوں گا۔ آج جو قومیں نفرت کرتی ہیں، کل کو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائیں گی، دشمنی کرنے کے بجائے تمہاری خادم بن جائیں گی، قلوب تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جب آدمی اللہ کا نائب بن کے اس کے کام کے لئے کھڑا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اس کی عداوت پر ہی کمربستہ رہے؟ ایک نہ ایک دن عداوت ختم کر دینی پڑے گی۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ ہمیں دوسروں کا اقتدار چھیننا ہے نہ دولت چھیننی ہے نہ کسی قوم سے حسد ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ بس نیک اور صالح بن جاؤ، پروگرام جبھی پیش کریں گے جب خود عامل ہوں۔ ہم نمونہ بن کے

سامنے آئیں اگر ہم کہیں کچھ اور نمونہ دوسرا پیش کریں، دنیا ہماری بات کو کبھی نہیں مانے گی۔ کہنے کی ضرورت نہیں، کر کے دکھلانے کی ضرورت ہے، دنیا جھک جائے گی۔

دنیا کے اقوام کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں کسی کا مقصد دولت، کسی کا روٹی، کسی کا اقتدار جبکہ اسلام اور مسلمانوں کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے، میں رہوں یا نہ ہوں اللہ کا نام اونچا ہونا چاہئے۔ میں اللہ کا نائب بن کے آیا ہوں، میں تو اسی کے نام کا داعی ہوں، جب تک آپ اللہ کے نام کی دعوت دیتے رہیں گے، اللہ کی حکومت کی قوت آپ کی پشت پر رہے گی۔ جب اسے چھوڑیں گے، قوت ختم ہو جائے گی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادشاہ جب کوئی قانون نافذ کرتا ہے۔ تو قانون کو گورنروں کے پاس بھیجتا گورنر کمشنر کے پاس اور کمشنر کلکٹر کے پاس اور کلکٹر تحصیل دار کے پاس بھیجتا ہے اور تحصیل دار کیا کرتا ہے؟ وہ ڈھنڈورچی بلاتا ہے ڈھول اس کے گلے میں ہے، اسے کہتا ہے کہ اس قانون کی منادی کر دے، تو ڈھنڈورچی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ معمولی اس کی تنخواہ ہوگی لیکن جب سرکاری قانون کی منادی کرتا ہے، گورنمنٹ کی پوری قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت آپ اس کے گلے میں سے ڈھول نکال کر تھپڑ ماریں، پوری گورنمنٹ مدعی بن جائے گی۔ کیونکہ تم نے گورنمنٹ کے قانون کی منادی کرنے والے کی توہین کی، گویا گورنمنٹ کی توہین کی، مقدمہ قائم ہو جائے گا، تو ڈھنڈورچی کی کوئی قوت نہیں، اصل قوت گورنمنٹ کی ہے۔ جب ایک مسلمان منادی بنے گا، اور اللہ کے دین کا داعی بن کر اس کے قانون کو دنیا میں پکارتا پھرے گا۔ اس حالت میں اگر اس کی کوئی توہین و تذلیل کرے وہ گویا خدا کی گورنمنٹ کی توہین کر رہا ہے، تو معلوم یہ ہوا کہ ہمارے طاقت دین اسلام، ایمان، خلافت اور روحانیت سے ہے، ہتھیار دولت اور بلڈنگوں میں ہماری طاقت نہیں ہے، ہماری طاقت تو اللہ کے نام اور کام میں ہے تو گویا زندگی کے دو مقصد نکلے، ایک عبادت اور دوسرا خلافت، عبادت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا:

یبنی اقم الصلوٰۃ (۴)

حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے میرے بیٹے: نماز قائم کر،
نماز ہی چونکہ اصل میں عبادت ہے۔

اس کا مطلب یہ نکلا کہ خدا کا عبادت گزار بندہ بن، اللہ کے آگے اپنی ذلت پیش کر، اسی میں تیری اور رخصت وسربلندی ہے، تو یہ فریضہ عبادت کا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات خلافت جس کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

وامر بالمعروف وانه عن المنكر

معروف کا امر کر اور منکر سے ممانعت کر۔

یعنی دنیا میں نیکی پھیلاؤ، اور برائیاں مٹاؤ۔ دنیا کی قوموں کو اچھے کاموں کی عادت ڈالو، برے کاموں سے روکو۔ فحش و بے حیائی کو مٹاؤ بے غیرتی و بے حمیتی کا دنیا سے خاتمہ کرو۔ حیاء ایثار، سخاوت، مروت اور شجاعت ان اخلاق کو دنیا میں پھیلاؤ، تاکہ اللہ کی اطاعت وعبادت دنیا میں پھیلے اور بغاوت ختم ہو اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا۔ امر بالمعروف یعنی نیکی کا آرڈر دینا، نہی عن المنکر برائی سے روک دینا۔ اصل میں یہ کام اللہ کا ہے وہ ہے سب سے بڑا امر فرمانے والا، اور برائیوں کو روکنے والا ہے۔ مگر اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا کہ تم میری طرف سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ تو اس سے خلافت دینا ثابت ہوئی ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

الذين ان مكنهم في الارض اقاموا الصلوٰة واتوا الزكوٰة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله عاقبة الامور۔(۵)

اگر ہم ان مسلمانوں کو طاقت واقتدار اور بادشاہت دے دیں، تو ان کا مقصد کھانا پینا نہیں ہوگا، ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ترجمانی ہوگا۔ یہ نمازوں

کا نظام قائم کریں گے، صدقات پر دنیا کو مائل کریں گے، اچھی باتوں کا
آرڈر جاری کریں گے، برائیوں سے دنیا کو روکیں گے یہ ان کا کام ہوگا۔

معلوم ہوا سلطنت دینے کا بڑا مقصد امر بالمعروف کا نظام قائم کرنا اور منکرات کو دنیا سے مٹانا ہے۔ اسی کا نام خلافت ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے منصب نبوت میں مشغول ہوئے تو اپنی دعوت کو دین و دنیا کی جامع اصول پر قائم فرمایا، ہر ایک کے لئے تقسیم کار متعین فرما کر کامیابیوں اور ترقی کے مدارج طے کرا دیئے۔ کوئی صاحب وضو کوئی صاحب فراش و نعلین۔ کوئی گھوڑے کے اصطبل اور کوئی دربانی کا شرف رکھتا تھا۔ تمام شعبۂ حیات جن کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں موجود نظر آتے ہیں، تمام چیزوں کے دفاتر اور کاروبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خالی نہیں تھا۔ ہر ایک آپ ﷺ پر جاں نثار تھا۔ اس وقت کے حالات کتابوں کے ذریعہ ہم کو بہت دیر سے پہنچے، کیونکہ کتابیں تو بعد میں تدوین ہوئیں اور ان کتابوں میں جو تمدن اسلامی کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے وہ سلطنت اموی اور عباسی سے متعلق ہے بعض اوقات عیسائی وغیرہ بنو عباس کے اسلامی شہروں میں آتے تھے اور اپنے طور طریقے جو یونان اور فارس کے تمدن سے ہم آہنگ تھے مسلمانوں میں جاری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض اہل شام کے رسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے مذہب کو پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اہل کتاب نے جہالت سے فائدہ اٹھا کر سیرت اور احادیث کو مسلمانوں سے ترک کروایا، اسلامی تمدن تو ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا اور یہی شریعت ہی تمام ترقیات کا عنوان ہے۔ علم، ادب، فلسفہ، صنعت، تجارت، زراعت، ہر ہر شعبہ میں صحابہ کرامؓ ہی کی اقتداء کی جاتی تھی۔ ان میں اخلاق کی بلندی مثالی تھی۔ کسی ملت اور قوم کا تمدن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کے اندر اسلام اپنی اصل حقیقت کے ساتھ ظاہر نہ ہو جائے۔ قرآن کریم نے اجتماعی آداب کو یکجا کیا اور معرفت کے طریقوں کو جاری کیا اور جو کمالات رب العزت نے ودیعت فرمایا ہے اور

سنت نبویﷺ کو جاری کیا ہے وہی تہذیب اخلاق اور بہتر سے بہتر ہدایت کا طریقہ ہے۔ قرآن کریم نے انسانی بھائی چارہ اور آزادقسم کے نفع بخش طریقے بتائے اور صرف دس سال میں زندگی کو بام ترقی پر پہنچادیا۔ جو آج کل کے ادارے خواہ کتابت (تصنیف ولٹریچر)، حساب میں (فزکس یعنی طبیعات میں)، قضاء میں فیصلہ میں (عدال وانصاف)، جنگ وحرب میں صحت وتعلیم میں اس وقت کے کسی بھی اسلامی ادارے کو پہچان بھی نہیں سکتے، کیونکہ اسلامی تمدن میں ایسی دادگی وجاذبیت تھی (جس کو آج کے مغربی تمدن کے دلدادہ پس ماندہ کہتے ہیں) ابن خلدون نے کہا اس دور کے مذاہب میں کوئی علم والے نہیں تھے نہ تو صنعت اور کاریگری میں لیکن اللہ جل شانہ کے اوامر اور نواہی کو سیکھنے سکھانے میں لگے رہتے تھے علم کو سینہ بہ سینہ منتقل کیا کرتے تھے۔ تعلیم اور تالیف وتدوین سے ناآشنا تھے۔ اس طرف رجوع نہیں کرتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ نہ ہی حاجت پیش آتی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دور اس عروج پر پہنچا کہ اس کی مثال نہیں ملتی، صرف دس سال میں لوگوں کے اندر ہر حیثیت سے مثلاً علمی، کتابی یا تربیتی ہر عنوان سے ایک جامع قوت اور عظیم الشان اتحاد ان میں پیدا ہوگیا تھا۔ دعوت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام پذیر ہوا۔ اس مختصر عرصہ میں ایسا نظام حکومت معاشرہ میں پیش کیا کہ دوسری قومیں سینکڑوں سال میں بھی نہ کرسکیں، ذرا غور تو کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل چہار طرف ویرانہ، ہلاکت، ظلمت مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ رومی سلطنت ہار گئی اور اہل فارس ناکام ہوگئے طویل جنگ وجدال جہالت کا دور دورہ تھا۔ قبائل عرب کی ناکامی اور ان کی جہالت، کفر وضلالت کو بھی پیش نظر رکھئے۔ اس اثناء میں یہ نور نبوت کا شعلہ جلوہ گر ہوا اور عالم کو روشن کردیا۔ بنیادی حقوق کی نشر واشاعت، لوگوں کی تعلیم وتربیت دیکھتے دیکھتے مکمل ہوگئی۔ (۶)

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مختلف انواع کے علوم کے سمندر بن گئے۔ علوم شریعت، عقلیات، حسابیات، سیاسیات اور علوم ظاہر وباطن یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف فرما تھے

اور بسم اللہ کی ''ب'' پر عشاء سے طلوع فجر تک بحث فرماتے رہے۔ حالانکہ اس وقت تک مروجہ معنوں میں ان حضرات نے ایک ورق بھی نہیں پڑھا تھا۔ نہ کوئی کتاب وغیرہ، جہاد فی سبیل اللہ سے انہیں فراغت نہ مل سکی حتیٰ کہ بعض اصولیین نے کہا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ بھی نہ ملا ہوتا تب بھی آپ ﷺ کی نبوت کے اثبات کے لئے کافی تھے۔ ان حضرات نے قرآن کریم کا ایسا علم سیکھا اور سکھایا کہ تھوڑی مدت میں نفرتیں محبتوں میں بدل گئیں اور مثالی نمونہ بن کر دنیا کو دکھا دیا کہ مسلمان کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔ اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی، معاملات کی صفائی ہر ایک میں سرایت کر گئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زراعت صناعت اور تعلیم کو ایسا فروغ حاصل ہوا کہ آج تک لوگ اس سے سیراب ہوتے چلے آرہے ہیں۔ تعلیم کا ایسا حکم فرمایا کہ اگرچہ کفار کے ملک میں ہو پھر بھی تو اسے حاصل کرو۔ جنگی حکمت عملی میں خندق کھودی گئی۔ مساجد میں قندیل و چراغاں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے شروع کیا۔ علوم و معارف کی اشاعت اور وظائف کی تقسیم، اخوت، صحت جسمانی، طب، علم احکامات، طبعی حکمت، تاریخ، جغرافیہ، سیرت، سیاحت، علم اکتشافات اور اختراعات اور ایجادات، علم نجوم و ہیئت، علم حساب، روایات اور قصہ گوئی، اقتصادیات مالیات، شماریات، کافر اور ذمی کے معاملات، امور داخلیہ اور خارجیہ، جنگ و صلح، حقوق زوجین، بلکہ ہر اس کام کا حکم صادر فرمادیا جو متمدن اور مہذب لوگوں کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے، پس جو شخص اس دین متین کی حقیقت کو پانا چاہے اس کے لئے اخلاق اور اعمال واجب اور فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہر عمل کے لئے آداب، حقوق اور فرائض مقرر فرمائے ہیں۔ رہن کا طریقہ سکھایا، سفر حضر، خرید و فروخت، ازدواجی زندگی کی راحتیں بھی بتائیں، یہ سب نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اللہ ہی نے سکھایا اور بتایا، جو سننے والوں کو تعجب میں ڈال دیتا ہے، تمام تعریفیں صرف اللہ ہی کے واسطے ہیں جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا اور تمام جہانوں میں فوقیت عطا فرمائی۔ لہٰذا کتاب اللہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے زیادہ کوئی علم خیر نہیں ہے اور یہی تمام دنیوی اور اخروی علوم کا سرچشمہ ہے اور اس کو وجوب شرعی

پر حمل کیا ہے۔ پس جو بھی اس کی اتباع کرے گا اس کی کامیابی کی دین و دنیا میں ضمانت ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ شریعت اسلامیہ کی مقرر کردہ عبادت میں جسمانی صحت اور اس کی کامیابی مضمر ہے اور آپ کی روحانی زندگی کی ترقی کا راز صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص کے ساتھ عمل میں پوشیدہ ہے، باقی شریعت اسلامیہ دنیاوی معاملات کے لئے ہے کہ انصاف کے کن امور کو اختیار کرنا ہے یا ان کو رد کر دینا ہے، بعض کاتبین نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں کائناتی علوم کے بارے میں سات سو پچاس ۷۵۰ سے زیادہ آیات میں لیکن فقہ کے بارے میں صریح آیات ایک سو پچاس ۱۵۰ سے زیادہ نہیں ہیں کئی طرق سے منقول ہے کہ تم میں سے وہ شخص بہتر نہیں ہے جو اپنی آخرت کی وجہ سے اپنی دنیا کو چھوڑ دے اور نہ دنیا کی وجہ سے اپنی آخرت کو چھوڑے، یہاں تک کہ وہ دونوں کو حاصل کرے، اس لئے کہ آخرت دنیا کا بلاغ، یعنی آخرت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور تم لوگوں پر بوجھ نہ بنو۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اس کے اخلاص کی وجہ سے دنیا دی گئی، اور وہ شرک سے محفوظ ہو، نماز قائم کرتا ہو، زکوٰۃ ادا کرتا ہو، وہ اس حال میں مرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوں گے، اور اگر کسی کو احد پہاڑ کے بقدر مال مل جائے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرتا ہو تو اس کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے، کوئی مال اس وجہ سے جمع کرتا ہے کہ اس سے قرض ادا کرے گا، صلہ رحمی کرے گا اور سوال کرنے سے بچے گا تو اس کے لئے اس میں خیر ہے، یہ نہ ہو کہ سارا مال صدقہ کر دے اور اس کا وارث لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرے، سمجھدار آدمی کی دلیل یہ ہے کہ اپنے معاشی حالات کی اصلاح کرے، غرض کہ شریعت اسلامیہ نے حقیقی ثروت اور نتیجہ خیز عمل کی طرف رہبری کی ہے اور آپ کے لئے ایسی خوشگوار زندگی کے اسلوب اور طریقے بتائے ہیں جو آج تمدن عالم کے نظام کی بنیاد ہیں، تم اے مسلمانو! غفلت میں بھٹکے پھر رہے ہو تو تعجب ہے کہ غیر مسلم تو اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہوں اور تم اس کو رد کر رہے ہو تم کو چاہئے کہ تم اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرو۔ (۷)

حضرت امام غزالیؒ نے فرمایا، رب العزت نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نبوت اور بادشاہت دونوں کو جمع کر دیا تھا، اس سے قبل کسی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ تمہارا بھتیجہ تو بہت بڑا بادشاہ بن گیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نہیں بلکہ وہ تو نبوت کی وجہ سے ہے اور دنیا نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس تحمل درگزر اور شان عبدیت کا مظاہرہ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے تھے، لیکن جب آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو عامل بنایا تو شریعت اسلامی کی نگرانی اور نبوت والے احکام کے مفہوم میں مقرر فرمایا نہ کہ بادشاہی کے طرز پر۔ (۸)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ساٹھ ۶۰ برس ہوگئی لیکن اس عمر میں بھی حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے، ولاۃ اور عمال کا تقرر، موذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائیدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لئے تعین وظائف، اجرائے فرامین، نومسلموں کے انتظامات خود کرتے تھے، جرائم کے لئے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدہ داروں کی خبر گیری اور احتساب، مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض آپ ﷺ خود انجام دیتے تھے۔

خلافت الٰہی کے ان فرائض و اعمال نے آپ ﷺ کے دل و دماغ پر جو بار عظیم ڈالا، اس نے آپ ﷺ کے نظام جسمانی کو چور چور کر دیا۔ عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ آخری زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، جو ضعف جسمانی کا اقتضاء تھا، لیکن یہ ضعف جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا۔ اس کا جواب حضرت عائشہؓ کی زبان سے سننا چاہئے جن سے بڑھ کر آپ ﷺ کے اعمال زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہوسکتا۔

عن عبداللّٰہ بن شقیق قال سألت عائشہ افکان یصلی قاعد اقالت حینَ حطمہ الناس (۹)

عبداللہ بن بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں! لیکن اس وقت جب لوگوں نے آپ ﷺ کو چور چور کر دیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا کے امیر الجیش اگر چہ اکابر صحابہ ہوتے تھے، لیکن جو بڑے معرکے پیش آتے تھے، ان کی قیادت خود آپ ﷺ بہ نفس نفیس فرماتے تھے۔ چنانچہ بدر، احد، خیبر، فتح مکہ، تبوک میں خود آپ ﷺ ہی امیر العسا کر تھے۔ اس کا مقصد صرف فوج کا لڑانا اور آخری فتح وظفر حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجاہدین اسلام کی جن معمولی معمولی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہے وہ احادیث میں بہ تصریح مذکور ہیں اور اسلام کا قانون جنگ اسی داروگیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے۔

اگر چہ آپ ﷺ کے عہد مبارک میں عہدہ قضاء قائم ہو چکا تھا حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو آپ ﷺ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا، تاہم مدینہ اور اس کے حوالی و مضافات کے تمام مقدمات کا آپ ﷺ خود فیصلہ فرماتے تھے اس کے لئے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی، امام بخاری نے ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے:

باب ماذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لہ بواب(۱۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر دربان نہ تھا۔

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپ ﷺ اطمینان وسکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ عورتوں کے معاملات عموماً زنان خانہ ہی میں پیش ہوتے تھے، احادیث کی کتابوں میں آپ ﷺ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری مقدمات مذکور ہیں۔

منصب نبوت کے بعد آپ ﷺ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہوگئی تھی، اس لئے آپ ﷺ کی خدمت میں جولوگ حاضر ہوتے تھے ان کا تعلق بھی خلافت الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا اور آپ ﷺ اسی حیثیت سے ان کی مہمانداری فرماتے تھے، مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبول اسلام کے لئے آتی تھی جن کی مہمانداری کے لئے آپ ﷺ نے ابتدائے نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلالؓ کو مامور فرمادیا تھا۔ چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ ﷺ اس کو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے وہ قرض لے کر اس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے، جب آپ ﷺ کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اس کے ذریعہ سے وہ قرض ادا کیا جاتا، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی کام میں صرف کیا جاتا۔(۱۱) کبھی کبھی اس غرض کے لئے آپ ﷺ تمام صحابہ کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے اور جو رقم ہوتی وہ ان مفلوک الحال مہاجرین کی اعانت میں صرف ہوتی۔ چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ پا وسر جماعت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کی پریشان حالی دیکھی، دیکھا تو چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فوراً حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک انصاری اٹھے اور ایک ٹوکرا جو اس قدر وزنی تھا کہ ان سے بمشکل اٹھ سکتا تھا، لاکر آپ ﷺ کے آگے ڈال دیا۔ اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا اور تھوڑی دیر میں ان بے سروسامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا۔(۱۲)

فتح مکہ کے بعد اطراف ملک سے بکثرت وفود آنے لگے۔ آپ ﷺ بہ نفس نفیس ان کی خاطر مدارات کرتے تھے اور ان کے لئے حسب حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے۔ قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ آپ ﷺ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ ﷺ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھا:

جیز وا الو فود بنحو ما کنت اجیز ھم۔ (۱۳)

جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا اسی طرح تم بھی دیا کرنا۔

تمدن اسلام کے دور ترقی میں محکمہ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شراء اور معاملات کی درستگی کی نگرانی کرتا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا بلکہ خود ہی آپ ﷺ اس فرض کو ادا فرماتے تھے۔ ہر شخص کے جزئیات اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق آپ ﷺ وقتاً فوقتاً نگرانی فرماتے رہتے تھے، تجارتی معاملات کی بھی نگرانی آپ ﷺ خود فرماتے تھے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابل اصلاح تھی اور مدینہ آنے کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغہ احتساب سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے اور تمام لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے، ان کو سزائیں دلاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

لقد رایت الناس فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتباعون جزانا یعنی الطعام یضربون ان یبیعوہ فی مکانھم حتیٰ یودوہ الی رحالھم

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے، ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں سے اس کو خریدا تھا۔

کبھی کبھی تحقیق حال کے لئے آپ ﷺ خود بازار تشریف لے جاتے، ایک بار آپ ﷺ بازار سے گزرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا، اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی۔ دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد ہوا

کہ پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا تا کہ ہر شخص کو نظر آئے جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔(۱۴)

فرائض احتساب میں آپ ﷺ کا سب سے بڑا فرض عمال کا محاسبہ تھا، یعنی جب عمال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے تو آپ ﷺ اس غرض سے ان کا جائزہ لیتے تھے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا۔ چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا، وہ اپنی خدمت انجام دے کر واپس آئے آپ ﷺ نے ان کا جائزہ لیا، تو انہوں نے کہا یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیۃً ملا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھر بیٹھے بیٹھے تو کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی۔

قضا و اقامت عدل، بسط امن، نزاع کے لئے متعدد ولاۃ و احکام کی ضرورت تھی۔ اس غرض سے آپ ﷺ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرمایا۔

باذان بنؓ ساسان: بہرام گور کے خاندان سے تھے، اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا والی مقرر فرما دیا۔

شہر بن باذانؓ: باذان بن سامان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا۔

خالد بن سعیدؓ بن العاص: شہر بن باذان مارے گئے تو ان کے بعد آپ ﷺ نے ان کو صنعاء میں عامل مقرر فرمایا۔

مہاجرؓ بن امیہ المخزومی: آپ ﷺ نے ان کو کندہ و صدف کا والی مقرر فرمایا تھا، لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ ﷺ نے انتقال فرمایا۔

زیاد بن لبید الانصاریؓ: حضرموت کے والی تھے۔

ابوموسیٰ اشعریؓ: زبیدہ عدن، زمعہ، وغیرہ کے والی تھے۔

معاذ بن جبلؓ: والی جند

عمر بن حزمؓ: والی نجران

یزید بن ابی سفیانؓ: والی تیما

عتاب بن ارسید: والی مکہ

علیؓ بن ابی طالب: متولی اخماس یمن

عمرو بن العاصؓ: والی عمان

علاء بن حضرمیؓ: والی بحرین

ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر سایہ آئے ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے۔ خالد بن سعیدؓ کو صنعاء پر، مہاجر بن ابی امیہؓ کو کندہ، زیاد بن لبید کو حضر موت پر، معاذ بن جبلؓ کو جند پر، ابوموسیٰ اشعریؓ کو زبیدہ، زمعہ، عدن اور سواحل پر۔ (۱۵)

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں عامل مقرر فرماتے تھے تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔ ملکی انتظام، فصل مقدمات اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعت اسلام اور سنن و فرائض کی تعلیم تھی۔ اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ لوگ حاکم اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغ دین اور معلم اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

لیکن اہل عرب کے دلوں کو مسخر کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت نرمی اور خوش خوئی کی ضرورت تھی جن کی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ جب معاذ بن جبلؓ کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے

دونوں کو وصیت فرمائی:

یسر اولا تعسر ابشر اولا تنفر واتطاوعا

ولا تختلِفاً(۱۶)

آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا ان کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذ بن جبل جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو ان سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے:

احسن خلقک للناس

لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ کرنا۔

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحمدل کیوں نہ ہو، لیکن ابتداء میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضہ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لئے اس کو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ریگستان عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے سنگ گراں سے نہ دبا۔ یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب صحابہ عمال حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو ان کو سخت استعجاب ہوتا تھا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقینات کے ذریعہ سے ان کو روکتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں، انہوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی۔ لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لئے ان لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جا رہی ہے، انہوں نے یہ سن کر کہا:

اشهد لسمعت رسول الله صلى الله عليه وسلّم يقول،

ان الله يعذب الذين يعذبون الناس فى الدنيا۔(۱۷)

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے

کہ اللہ ان لوگوں کو سزا دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

عمال کا انتخاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے خود پیش کرتے تھے، ان کی درخواست نامنظور ہوتی تھی۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں۔ آپ ﷺ نے دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے، لیکن اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا۔

عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا، آپ ﷺ نے عام منادی فرمادی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لے گا وہ خائن ہے، مقدار ضرورت کی تصریح خود آپ ﷺ نے فرمادی تھی۔

من كان لنا عاملاً فليكتسب زوجه فان لم يكن له خادمه فليكتسب خادم وان لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا و من اتخذ غير ذٰلك فهو غال،

جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بی بی کا خرچ لینا چاہئے، اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ تو مکان کا، لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا۔

آپ ﷺ کے زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملا تھا۔ چنانچہ ان کے عہد خلافت میں جب صحابہ نے زہد و تقدس کی بناء پر معاوضہ لینے سے انکار کیا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل سے استدلال کیا۔ (۱۸)

عرب میں کفر و شرک کا مالکل وجود نہ تھا، کہیں کہیں صرف مجوس، نصاریٰ اور یہود کی

آبادیاں تھیں، ان میں سے معتد بہ افراد نے گو نور ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ اب تک تاریکی میں تھے۔ تاہم خلافت الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے۔ حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی۔ اس لئے اسلام نے بھی ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا، بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی یا جو چیز بنتی تھی وہی چیز جزیہ قرار پاتی تھی۔

غیر قوموں میں سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ ہجری میں خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیماء کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی۔ اس وقت تک آیت جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بناء پر باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے وہ آیت جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے۔ اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے۔

۹ ھجری میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی، اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رو سے قرار پائے۔ نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آ کر مصالحت کی درخواست کی، جس کی آپ ﷺ نے منظوری فرمائی، شرائط صلح یہ تھے کہ وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیں گے اور ان کو دو قسطوں میں یعنی آدھا ماہ صفر اور آدھا ماہ رجب میں ادا کر دیں گے۔ اگر یمن میں کبھی بغاوت یا شورش ہو گی تو وہ عاریۃً تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس تیس عدد ہر قسم کے ہتھیار دیں گے اور مسلمان ان کی واپسی کے ضامن ہوں گے۔ اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے، نہ ان کے گرجے ڈھائے جائیں گے نہ ان کے پادری نکالے جائیں گے، نہ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا۔

حدود شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے۔ رجب ۹ ہجری میں

غزوہ تبوک کے موقع پر دومتہ الجندل ایلہ، مقنا، جرباء اذرح، تبالہ اور جرش کے کے جو عیسائی اور یہودی زمیندار اسلام نہیں لائے بلکہ جزیہ دینا قبول کیا، ان میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا، اور مسلمان جب ادھر سے گزریں تو ان کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی۔ ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد نہ ادا کرسکیں تو اس کے برابر معافری کپڑا دیا کریں، بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرح مقدار پر مصالحت کی گئی۔(۱۹)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ شریعت طریقت اور سیاست، ص۱۶، ۱۷، افادات حضرت شاہ مولانا الیاسؒ، حکیم الاسلام قاری طیب قاسمی مرتب عابد سندھی، ناشر مولوی محمد عظیم کتب خانہ شکارپور، ۱۹۹۱ء

۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۱، ۲۲، حکومت اور دین کا تعلق سندھی حضرت سید سلیمان ندوی، ناشر صدیقی ٹرسٹ، کتابی سلسلہ، ص ۸۵۳

۴۔ قرآن اور سیاست مؤلف محمد فاروق ناشر مدرسہ اسلامیہ مظہر العلوم تحصیل بانڈہ ضلع کرک، فروری ۱۹۹۲ء، ص ۱۲، ۱۳

۵۔ سورۂ حج، آیت ۴۱

۶۔ دور نبوی ﷺ کا نظام حکومت، اختصار و ترجمہ شہرہ آفاق کتاب التراتیب الاداریۃ، تالیف علامہ عبدالحی کتانی، ۱۳۴۱ھ، ترجمہ مولانا معظم الحق ناشر: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی، ص ۷، ۸

۷۔ دور نبوی کا نظام حکومت، ص ۱۰، ۱۱

۸۔ دور نبوی کا نظام حکومت، ص ۱۲

۹۔ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، بحوالہ سیرت النبی ﷺ، ج ۲، مصنف علامہ شبلی نعمانی، علامہ

سید سلیمان ندوی، ناشر دارالاشاعت کراچی،

۱۰۔ سیرت النبی ﷺ، مصنف علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ناشر: دارالاشاعت کراچی، ج ۲، ص ۴۱

۱۱۔ ابوداؤد کتاب الخراج ولامارۃ، باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین، بحوالہ سیرت النبی ﷺ، ج ۲، ص ۴۱

۱۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۳۵۸

۱۳۔ الصحیح البخاری، ج ۱، باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب، بحوالہ:: سیرت النبی ﷺ ج ۲، ص ۴۲

۱۴۔ سیرت النبی ﷺ، علامہ شبلی نعمانی، ج ۲، ص ۴۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۶۔ صحیح مسلم، ج ۲، ص ۶۳، کتاب الایمان، ناشر قدیمی کتب خانہ

۱۷۔ صحیح مسلم، باب الموعد الشدید لمن عذاب الناس بغیر حق بحوالہ سیرت النبی ﷺ، ج ۲، ص ۴۷

۱۸۔ ابوداؤد، ج ۲، باب ارزاق العمال، ص ۵۰، بحوالہ سیرت النبی ﷺ

۱۹۔ ابوداؤد باب اخذ الجزیۃ من المجوس بلاذری ذکر بحولین، بحوالہ: سیرت النبی ﷺ علامہ شبلی نعمانی، ج ۲، ص ۵۱،